مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

عوام کے لئے تقلیدِ محض کی ضرورت

تقلید کا سب سے پہلا درجہ "عوام کی تقلید" کا ہے۔ یہاں "عوام" سے ہماری مراد مندرجہ ذیل اقسام کے حضرات ہیں:

۱۔ وہ حضرات جو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بالکل ناواقف ہوں، خواہ وہ دوسرے فنون میں کتنے ہی تعلیم یافتہ اور ماہر و محقق ہوں۔

۲۔ وہ حضرات جو عربی زبان جانتے اور عربی کتابیں سمجھ سکتے ہوں۔ لیکن انہوں نے تفسیر وحدیث و فقہ اور متعلقہ دینی علوم کو باقاعدہ اساتذہ سے نہ پڑھا ہو۔

۳۔ وہ حضرات جو رسمی طور پر اسلامی علوم سے فارغ التحصیل [illegible] ہوں۔ لیکن تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے اصولوں میں اچھی استعداد اور بصیرت پیدا نہ ہوئی ہو۔

یہ تینوں قسم کے حضرات تقلید [illegible] باب میں [illegible] ہی کی صف میں شمار ہوں گے، اور تینوں کا حکم ایک ہے۔ اس قسم کے عوام کو "تقلید محض" کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ ان میں اتنی استعداد اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ براہ راست کتاب و سنت کو سمجھ سکیں، یا اس سے متعارض دلائل میں تطبیق و ترجیح کا فیصلہ کر سکیں۔ لہذا احکام شریعت پر عمل کرنے کے لئے ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ کسی مجتہد کا دامن پکڑیں اور اس سے مسائل شریعت معلوم کریں، چنانچہ علامہ خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔

اما من یسوغ له التقلید فهو العامی الذی لایعرف طرق الحکام الشر عیته فیفو زله ان یقلد عالماً ویعمل بقوله .... ولانه لیس من اهل الاجتها دفکان فرضه التقلید کتقلید الاعمیٰ فی القبلة فانه لعالم یکن معه الة الاجتهاد فی القبلة کان علیه البصیر فیها

الفقیه والمتفقه، للخطیب البغادی ص ٦٨ مطبوعه دارالافتاء سعودیه ریاض ١٣٨٩ء

"رہی یہ بات کہ تقلید کس کے لئے جائز ہے؟ سو وہ عامی شخص ہے جو احکام شرعیہ کے طریقوں سے واقف نہیں، لہذا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عالم [illegible] ل پر عمل پیرا ہو.......... (آگے قرآن و سنت سے اس کی دلیلیں بیان کرنے [illegible] کہ وہ (عامی آدمی) اجتہاد کا اہل نہیں ہے لہذا اس کا فرض یہ ہے کہ وہ بالکل اس طرح تقلید کرے جیسے ایک نابینا قبلہ کے معاملے میں کسی آنکھ والے کی تقلید کرتا ہے، اس لئے کہ جب اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ اپنی ذاتی کوششوں کے ذریعہ قبلہ کا رخ معلوم کر سکے۔ تو اس پر واجب ہے کہ کسی آنکھ والے کی تقلید کرے۔"

اس درجے کے مقلد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ دلائل کی بحث میں الجھے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ کون سے فقیہ و مجتہد کی دلیل زیادہ راجح ہے؟ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کسی مجتہد کو متعین کر کے ہر معاملے میں اسی کے قول پر اعتماد کرتا رہے۔ کیوں کہ اس کے اندر اتنی استعداد موجود نہیں ہے کہ وہ دلائل کے راجح و مرجوع ہونے کا فیصلہ کر سکے بلکہ ایسے شخص کو اگر اتفاقاً کوئی حدیث ایسی نظر آ جائے جو بظاہر اس کے امام مجتہد کے مسلک کے خلاف معلوم ہوتی ہو تب بھی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے امام و مجتہد کے مسلک پر عمل کرے اور

حدیث کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ اس کا صحیح مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔ یہ کہ امام مجتہد کے پاس اس کے معارض کوئی قوی دلیل ہوگی۔

بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مجتہد کے مسلک کو قبول کر لیا جائے اور حدیث میں تاویل کا راستہ اختیار کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس درجہ کے مقلد کا بیان ہو رہا ہے اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور اگر ایسے مقلد کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف پا کر امام کے مسلک کو چھوڑ سکتا ہے تو اس کا نتیجہ شدید افراتفری اور سنگین گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط ایک ایسا وسیع و عمیق فن ہے کہ اس میں عمریں کھپا کر بھی ہر شخص اس میں عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ بسا اوقات ایک حدیث کے ظاہری الفاظ سے ایک مفہوم نکلتا ہے، لیکن قرآن و سنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس کا بالکل دوسرا مفہوم ثابت ہوتا ہے اب اگر ایک عام آدمی صرف ایک حدیث کے ظاہری مفہوم کو دیکھ کر اس پر عمل کرے تو اس سے طرح طرح کی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، خود راقم الحروف کا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے علوم میں گہری استعداد کے بغیر جن لوگوں نے براہ راست احادیث کا مطالعہ کر کے ان پر عمل کی کوشش کی ہے وہ غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہوتے پرلے درجہ کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے۔

راقم الحروف کے ایک گریجویٹ دوست مطالعے کے شوقین تھے۔ اور انہیں بطور خاص احادیث کے مطالعہ کا شوق تھا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ان کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی کہ اگرچہ میں حنفی ہوں لیکن اگر حنفی مسلک کی کوئی بات مجھے حدیث کے خلاف معلوم ہوئی تو میں اسے ترک کردوں گا، چنانچہ ایک روز انہوں نے احقر کی موجودگی میں ایک صاحب کو یہ مسئلہ بتایا کہ "ریح خارج ہونے سے اس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا جب تک ریح کی بدبو محسوس نہ ہو یا آواز نہ سنائی دے" میں سمجھ گیا کہ وہ بیچارے اس غلط فہمی میں کہاں سے مبتلا ہوئے ہیں، میں نے بر چند انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن شروع میں انہیں اس بات پر اصرار رہا کہ یہ بات میں نے ترمذی کی ایک حدیث میں دیکھی ہے، اس لئے میں تمہارے کہنے کی بناء پر حدیث کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آخر جب میں نے تفصیل کے ساتھ حدیث کا مطلب سمجھایا اور حقیقت واضح کی تب انہوں نے بتایا کہ میں تو عرصہ دراز سے اس پر عمل کرتا آرہا ہوں اور نہ جانے کتنی نمازیں میں نے اس طرح پڑھی ہیں کہ آواز اور بو نہ ہونے کی وجہ سے میں سمجھتا رہا کہ میرا وضو نہیں ٹوٹا۔

دراصل وہ اس سنگین غلط فہمی میں اس لئے مبتلا ہوئے کہ انہوں نے جامع ترمذی میں یہ حدیث دیکھی کہ:

عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الاوضو الامن صوت اوريح

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وضو اسی وقت واجب ہے جبکہ با آواز ہو یا بد بو ہو۔

اسی کے ساتھ جامع الترمذی میں یہ حدیث بھی انہیں نظر پڑی کہ:

اذاكان احدكم في المسجد فوجد ريحابين البيته فلا يخرج حتى يسمع صوتاً او يجد ريحاً

اگر تم میں سے کوئی شخص مسجد میں ہو اور اسے اپنے سرینوں کے درمیان ہو تو وہ اس وقت مسجد سے (بہ ارادہ وضو) نہ نکلے جب تک اس نے (خروج ریح کی) آواز نہ سنی ہو یا اس کی بد بو نہ محسوس کی ہو۔

(جامع ترمذی ۱۵ ص ۱ ۳ باب ماجاء فی الوضوء من الریح)

اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے انہوں نے یہی سمجھا کہ وضو ٹوٹنے کا مدار آواز یا بو پر ہے، حالانکہ تمام فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان وہمی قسم کے لوگوں کے لئے ہے۔ جنہیں خواہ مخواہ وضو ٹوٹنے کا شک ہو جاتا ہے اور مقصد یہ ہے کہ جب تک خروج ریح کا ایسا یقین حاصل نہ ہو جائے جیسا کہ آواز سننے یا بو محسوس کرنے سے حاصل ہوتا ہے اس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ چنانچہ دوسری روایات میں حدیث کا یہ مطلب صاف ہو گیا ہے۔ مثلاً ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی روایت کے الفاظ ہیں:۔

اذکان احدکم فی الصلوۃ فوجد حرکۃ فی دبرہ احدث اولم یحدث فاشکل علیہ فلا ینصرن حتیٰ یسمع ثوتاً او یجد ریحاً

اگر تم میں سے کوئی شخص نماز میں ہو اور اسے اپنی پشت میں حرکت محسوس ہونے لگے کہ ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں تو اس کو چاہیے کہ اس وقت تک وہ وہاں سے نہ ہٹے جب تک آواز نہ سن لے یا بو نہ پالے۔

(سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۴ باب من شک فی الحدیث)

نیز ابو داؤد میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے واضح فرما دیا ہے کہ یہ جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کو دیا تھا جو اس معاملے میں اوہام وساوس کا مریض تھا۔

لیکن حدیث کے مختلف طریق اور الفاظ کو جمع کر کے ان سے کسی نتیجہ تک وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو علم حدیث کا ماہر ہو۔ محض ایک کتاب میں کوئی حدیث یا اس کا ترجمہ دیکھ کر تو انسان اسی گمراہی اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گا جس میں وہ صاحب مبتلا ہوئے تھے۔

اسی طرح اگر ہر شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ کسی حدیث کو اپنے امام کے مسلک کے خلاف دیکھ کر امام کا مسلک چھوڑ سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ جامع ترمذیؒ میں اس کو یہ حدیث نظر پڑے کہ:

عن ابن عباس قال جمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین الظھر والعصر، وبین المغرب والعشاء بالمدینۃ من غیر خوف ولا مطر، قال فقیل لابن عباس ماارادابذالک؟ قال ارادان لاتحرج امتہ،

ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کیا تھا؟ انہوں نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی امت تنگی میں مبتلا نہ ہو۔ (جامع ترمذی، ج ۱ ص ۴۶)

اس حدیث کی بناء پر ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ظہر کی نماز عصر کے وقت میں اور مغرب کو عشاء کے وقت میں اکٹھا کر کے پڑھنا بغیر کسی سفر کے اور عذر کے بھی جائز ہے اور چونکہ میرے امام مجتہد کا مسلک اس حدیث صریح کے خلاف ہے اس لئے میں مجتہد کا مسلک ترک کر کے حدیث پر عمل کرتا ہوں حالانکہ اس حدیث کا مطلب آئمہ اربعہ اور اہل حدیث میں سے کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہے کہ جمع بین الصلوٰتین بغیر عذر کے جائز ہے، بلکہ اس کو قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں صرف حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ بلکہ اہل حدیث حضرات نے بھی جمع صوری کے معنی پر محمول کیا ہے

(ملاحظہ ہو تحفۃ الاحوذی، للمبارک پوریؒ ج ۱ ص ۱۶۶، ۱۶۷)

(یعنی یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز بالکل آخر وقت میں اور عصر کی بالکل اول وقت میں پڑھی اور اس طرح ظاہری اعتبار سے دونوں کی ادائیگی ایک ساتھ ہو گئی۔)

یہ دو مثالیں محض نمونے کے طور پر پیش کر دی گئیں، ورنہ ایسی احادیث ایک دو نہیں بیسیوں ہیں، جن کو قرآن و سنت کے علوم میں کافی مہارت کے بغیر انسان دیکھے گا۔ تو لامحالہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گا، اسی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے علم دین باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو۔ اسے قرآن و حدیث کا مطالعہ ماہر استاد کی مدد کے بغیر نہیں کرنا چاہیئے۔

یہ پھر یہ بات بھی پیچھے عرض کی جا چکی ہے کہ کسی امام و مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے جہاں قرآن و سنت کے دلائل میں تعارض محسوس ہوتا ہے۔ لہذا اگر ایک مسئلے کے جواب میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا اختلاف ہے تو ان میں سے کوئی بھی دلیل سے خالی نہیں ہوتا۔ تقلید کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ جو شخص ان دلائل میں راجح و مرجوع کا فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے وہ ان میں سے کسی ایک دامن پکڑ لے۔ اب اگر امام ابو حنیفہؒ کا دامن پکڑنے کے بعد اسے کوئی ایسی حدیث نظر آ جاتی ہے۔ جس پر امام شافعیؒ نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے تو اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ کے مسلک کو چھوڑ دے کیونکہ یہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ امام شافعی کی بھی کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہو گی، لیکن ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس دلیل کو کسی اور دلیل کی بنیاد پر چھوڑا ہے جو ان کے نزدیک زیادہ مضبوط اور قوی تھی۔ اس لئے ان کے مسلک کو حدیث کے خلاف نہیں کہا جا سکتا اور جس درجے کے مقلد کی بات ہو رہی ہے اس کے اندر چونکہ دلائل کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں ہے اس لئے وہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کس کی دلیل قوی ہے؟ چنانچہ اس کا کام صرف تقلید ہے اور اگر اسے کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف نظر آئے تب بھی اسے اپنے امام کا مسلک نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ حدیث کا مفہوم یا اس کا صحیح محمل میں سمجھ نہیں سکا۔

اس کی مثال بالکل یوں سمجھئے کہ دنیا میں آج جب بھی کسی شخص کو قانون کے بارے میں کوئی بات معلوم کرنی ہوتی ہے تو وہ کسی ماہر قانون کی طرف رجوع کرتا ہے، قانون کی کتابیں براہ راست دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اب اگر بالفرض وہ کسی ایسے ماہر قانون کے پاس جاتا ہے جس کی علمی مہارت اور تجربہ مسلم ہے اور جس کے بارے میں اسے یقین ہے کہ یہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا اور وہ ماہر قانون کسی قانونی نکتے کی وضاحت کرتا ہے تو اس کا فرض یہ ہے کہ اس کی بات پر اعتماد کر کے اس پر عمل کرے پھر اگر بالفرض اسے اتفاقاً قانون کی کوئی کتاب ہاتھ لگ جاتی ہے اور اس کا کوئی جملہ اسے بظاہر اس ماہر قانون کی بتائی ہوئی بات کے خلاف محسوس ہوتا ہے تب بھی اس کا کام یہ نہیں ہے۔ کہ وہ ماہر قانون کی بات کو رد کر دے بلکہ اس کو عمل اسی ماہر قانون کی بات پر کرنا ہو گا اور کتاب کے بارے میں یہ سمجھنا ہو گا کہ اس کا صحیح مطلب کچھ اور ہے جو میں نہیں سمجھ سکا۔ وجہ یہ ہے کہ قانون کی کتابوں سے کوئی نتیجہ نکالنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے اس فن کی مہارت اور وسیع تجربہ درکار ہے، یہ بات اس سے کہیں زیادہ صحت کے ساتھ قرآن و سنت پر صادق آتی ہے کہ اس سے مسائل شرعیہ کا

استنباط ان علوم کی زبردست مہارت کا متقاضی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ عوام کو براہ راست قرآن وحدیث سے احکام شریعت معلوم کرنے کے بجائے علماء فقہاء کی طرف رجوع کرنا چاہیئے بلکہ فقہاء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کسی عام آدمی کو کوئی مفتی غلط فتویٰ دیدے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا، عام آدمی کو معذور سمجھا جائے گا لیکن اگر کوئی عام آدمی کوئی حدیث دیکھ کر اس کا مطلب غلط سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ معذور نہیں ہے کیونکہ اس کا کام کسی مفتی کی طرف رجوع کرنا تھا خود قرآن وسنت سے مسائل کا استنباط اس کا کام نہ تھا۔

مثلاً سینگی، پچھنے لگوانے سے جمہور علماء کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن اگر کسی عام آدمی نے کسی مفتی سے مسئلہ پوچھا اور اس نے غلطی سے یہ مسئلہ بتا دیا کہ روزہ ٹوٹ گیا۔ اور اس کے بعد اس شخص نے یہ سمجھ کر کچھ کھا پی لیا کہ روزہ تو ٹوٹ ہی چکا ہے تو ہدایہ میں لکھا ہے کہ اس پر صرف قضا آئے گی۔ کفارہ نہیں آئے گا۔ صاحب ہدایہ اس کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "لان الفتویٰ دلیل شرعی في حقه"

(اس لئے کہ اس عام آدمی کے لئے مفتی کا فتویٰ دلیل شرعی ہے لیکن اگر کسی شخص نے ابوداؤد یا ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث دیکھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں ایک شخص کے پاس سے گزرے جو سینگی لگوا رہا تھا تو آپ نے فرمایا: **فطر الحاجم والمحجوم**" سینگی لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا

یہ حدیث سنداً صحیح ہے لیکن بخاری میں ایک دوسری حدیث مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزے کی حالت میں سینگی لگوائی ہے۔ اور نسائی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ دار کو سینگی لگوانے کی اجازت دی۔ ان احادیث کی بناء پر امام شافعیؒ "**الحاجم و المحجوم**" کا حکم یا تو منسوخ ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاص آدمیوں کو کوئی اور ایسا کام کرتے دیکھا ہوگا جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس حدیث کی اور بھی متعدد توجیہات کی گئی ہیں۔ (دیکھئے تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۴، ۶۵)

اور اس حدیث سے اس نے یہ سمجھ کر کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے کچھ کھا پی لیا تو امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اس پر کفارہ واجب ہوگا، کیونکہ اس کا فرض یہ تھا کہ وہ کسی مفتی سے مسئلہ پوچھتا اور اس نے یہ فرض ادا نہیں کیا۔ امام یوسف فرماتے ہیں:

لان علیٰ العامی الاقتداء بالفقهاء لعدم الهتداء في حقه الا معرفة الاحاديث.

عام آدمی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فقہاء کی اقتداء کرے اس لئے کہ وہ احادیث کا علم حاصل کرکے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ (ہدایہ جلد ۱، ص ۲۲۶، باب مایوجب القضاء والکفارۃ)

خلاصہ یہ ہے کہ عوام کے لئے تقلید کا پہلا درجہ متعین ہے یعنی ان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے امام مجتہد کے قول پر عمل کریں اور اگر انہیں کوئی حدیث امام کے قول کے خلاف نظر آئے تو اس کے بارے میں یہ سمجھیں کہ اس کا صحیح مطلب یا صحیح محمل ہم نہیں سمجھ سکے، اور جس امام کی ہم نے تقلید کی ہے۔ انہوں نے اس کے ظاہری مفہوم کو کسی دوسری قوی دلیل کی بنا پر چھوڑا ہے، عوام کے لئے اس طرز عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، ورنہ احکام شریعت کے معاملے میں جو شدید افراتفری برپا ہوگی اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔